ابوالکلام آزاد

سرمد شہیدؒ

آنانکہ غم تو برگزیدند ہمہ در کوے شہادت آرمیدند ہمہ
درمعرکہ دوکون فتح ازعشق است با آنکہ سپاہ او شہید ند ہمہ

عہدِ عالم گیری میں اور اس کے بعد جس قدر فارسی تذکرے لکھے گئے ہیں، اُن میں بالعموم سرمد کے عنوان سے چند سطریں ملتی ہیں، لیکن اول تو قدیم تذکروں کے حالات اس قدر مختصر اور ناکافی ہوتے ہیں کہ اگر زندگی میں ان کے نام خطوط لکھے جاتے تو لفافے کے لیے پورا پتا بھی میسر نہ آتا۔ اور پھر جو کچھ ہوں دِقت یہ ہے کہ وہ اس وقت سامنے نہیں۔مَیں نے عہدِ عالمگیری کی تاریخوں کو دیکھا کہ شاید حوادث و واقعات کے ضمن میں کچھ حالات مل جائیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پولیٹیکل عاقبت اندیشوں نے قلم کو روک لیا تھا۔ مرزا محمد کاظم نے عالم گیر کے حکم سے تمام سوانح و حالات بقیدِ سنین قلم بند کرنے شروع کیے، لیکن صرف دس سال ہی کے حالات لکھے تھے کہ حکماً یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاہ عالم کے عہد میں نواب عنایت اللہ کو خیالِ تکمیل ہوا۔ اس کے اشارے سے مستعد خاں نے بقیہ ۴۰ سال کے سوانح قلم بند کیے اور ابتدائی دہ سالہ مجموعے کا انتخاب شامل کر کے مآثر عالمگیری نام رکھا۔مَیں نے ۱۰۷۰ھ کے حالات کی ورق گردانی کی کہ یہی سرمد کی شہادت کا سن ہے۔ مگر حالات کا ملنا تو ایک طرف، معلوم ہوتا ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ تاریخ کے صفحوں کو بچایا گیا ہے کہ اس شہیدِ عشق کے جامۂ خونچکاں کے قطرہ افشانی سے حاشیہ پر کہیں دھبے نہ پڑ جائیں، لطف یہ کہ اسی سال شاہ

عباس ثانی اور حسین پاشا رومی (غالباً والی حجاز) کے سفراء آئے تھے۔ ان کے حالات کی سطریں صفحے کی انتہا تک پہنچ کر بھی آگے بڑھنے سے نہیں رکتیں، خیر یہ حالات بھی کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے تھے۔ طرہ بریں یہ کہ اس سال نواحِ دہلی میں کہیں چندلڑکے شاہ و وزیر کی نقل کھیل رہے تھے، ان میں ایک کوتوال اور ایک مجرم بھی تھا۔ مصنوعی کوتوال نے غیظ وغضب میں آ کر مصنوعی مجرم کو اصلی سزا دے دی، نصف صفحے کے قریب اس حادثۂ عظیم اور داستانِ الم کی نذر کیا گیا۔ مورخ کی نظر کا جب یہ حال ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسے قصوں کے ہجوم میں سرمد بے چارے کی نعش کیوں کر نظر آتی۔

خافی خان کی منتخب اللباب عہد مغلیہ کی مشہور ترین تاریخ ہے۔ جس نے اورنگ زیب کے حالات اس تفصیل سے لکھے ہیں گویا صرف یہی زمانہ موضوع کتاب ہے۔ قیاس کہتا تھا کہ اس نے یہ واقعہ نظرانداز نہ کر دیا ہوگا، کیوں کہ عالمگیری عہد کا قلم اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ جس کو ہر قدم پر روک لیے جانے کا اندیشہ ہو۔ مگر جب اسے کھولا تو ہزار صفحے کے سوانح میں ایک لفظ بھی سرمد کی نسبت نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ دُنیا کا سب سے بڑا راز مورخ کا قلم ہے۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی باگ میں کتنی گرہیں ڈال دی گئی تھیں۔

سرمد کی شہادت کا وہی سنہ ہے، جس سنہ میں کوچ بہار اور آسام پر چڑھائی کی گئی، اس لیے دونوں تاریخوں نے اس سال کے حالات کا نصف حصہ اسی فتح یابی کی داستان سرائی میں صرف کر دیا۔ فتح آسام کی اہمیت کے بیان میں شک نہیں مگر مستعد خاں کو کیا معلوم تھا، کہ تماشا گاہ عالم میں ایسی آنکھیں بھی ہیں جو اس شادمانی فتح پر غلط انداز نظر نہ ڈالیں گی مگر اس غم اثر شکست پر ہمیشہ خونچکاں رہیں گی جو ایک مجنون لیلائے حقیقت کو دار پر کھینچ کر معرکۂ حق پرستی میں عالم گیر کو نصیب ہوئی۔

قصہ مختصر بایں ہمہ دو کتابیں ایسی پیشِ نظر ہیں جن سے زیادہ تر معتبر راوی سرمد کے لیے نہیں ہو سکتے۔ پہلا شخص شیر خاں لودھی (مصنف مرأۃ الخیال) ہے جو بغیر کسی واسطے کے عالمگیری عہد کے واقعات لکھتا ہے، کیوں کہ اسی عہد کا تذکرہ نویس ہے۔ اس کا تذکرہ مرأۃ

الخیال میرے پاس ہے۔ دوسرا شخص علی قلی خاں داغستانی عہد محمد شاہ کے امراء میں سے ہے۔ جس نے نہایت تفحص و احتیاط سے شعرائے فارسی کا تذکرہ ریاض الشعراء مرتب کیا۔ اس کا قلمی نسخہ مصنف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے، اور زیادہ تر حالات میں نے اسی سے لیے ہیں۔ یہ گو عہد محمد شاہ میں لکھا گیا ہے، لیکن سرمد کے حالات کے لیے ایک واسطے سے زیادہ دُور نہیں۔ اس کے علاوہ تمام تذکروں نے جو کچھ لکھا ہے ذہن میں کچھ نہ کچھ تو محفوظ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک بیاض قلمی عہدِ عالمگیر ثانی کے کسی خوش مذاق شاعر سراج الدین سراج کی جمع کی ہوئی ہے، اس میں کہیں کہیں حالات بھی دیے ہیں۔ غرض کہ گلدستہ تو بنا مگر چند پتوں اور پنکھڑیوں کو دامن میں لے لیا ہے کہ مشہد سرمد میں جاؤں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں۔

سرمد کی قومیت اور مذہب:

سرمد کی اصل قومیت اور مذہب کو کوئی صاف نہیں بتلاتا۔ مصنف مرأۃ الخیال کا بیان ہے کہ ''اصلش از فرنگستان وارمنی بود'' مگر باقی تذکرے یہودی الاصل بتلاتے ہیں۔ والہ داغستانی اس پر اتنا اور بڑھاتا ہے کہ وطن کا شان تھا۔ مگر یہ اختلاف باہم متناقض نہیں، کیوں کہ ایران میں قدیم سے ارمینوں کی وسیع آبادی موجود ہے جو بالعموم مسیحی اور بعض بعض یہودی ہیں۔ اب تو اُنھوں نے یکسر یورپین طرزِ معاشرت اختیار کر لی ہے، اور تحصیلِ علومِ جدیدہ میں تمام ایرانی جماعتوں سے پیش رو ہیں۔ ایک صدی پیشتر تک ان میں مذہب کے سوا کوئی بات مسلمانوں سے مختلف نہ تھی، ان میں سے بعض اسلامی علوم و آداب کو اس حد تک حاصل کرتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ صحبت میں شریک ہو سکتے تھے، چناں چہ تذکروں میں متعدد شعرا کے حالات ملتے ہیں جو ارمنی اور مسیحی تھے مگر ان کے اشعار ایران کے مسلمان خوش گو شعرا سے کسی طرح کم نہیں۔ سرمد کا خاندان بھی ارمنی اور یہودی ہوگا۔ کاشان میں متوطن ہوں گے، ارمنی ہونے کی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ فرنگی ہے، اور باہر کے غیر معروف آدمی کی نسبت ایسا دھوکا ہونا کچھ عجیب نہیں۔

آفتاب جب چمکتا ہے تو باغ و چمن کو نہیں ڈھونڈتا کہ اپنی کرنوں کا انھیں نشیمن

بناؤں۔ اس کا فیضان ضو بخش مبدء فیاض کی طرح فیض عام ہے۔ محل سرائے شاہی کے کنگروں کے طلائی کلس اگر اس کی ضوفشانی سے چمک اٹھتے ہیں تو کیا جنگل کے خشک درختوں کی شاخوں پر سنہری رنگ نہیں چڑھ جاتا؟ مَیں کیا کہہ رہا ہوں! میرا مقصد نظامِ شمسی کے مرکز سے نہیں بلکہ آفتاب اسلام سے ہے۔ اس اوقیانوس تجلی کی لہریں اُٹھیں تو اُنھوں نے پہلے تو جسم وخون اور قوم ومرز بوم کے قائم کیے ہوئے امتیازات کو خس وخاشاک کی طرح بہا دیا۔ پھر سیرابی کا وقت آیا تو احرار قریش اور ارقاے حبش (حبشی غلام)، بطحا و یثرب اور عرب وفرنگ، تاج دار غستان و بادیہ نشین عرب، ادنیٰ واعلیٰ، نزدیک ودُور سب کو یکساں طور پر شریکِ فیض کیا۔ صرف صلاحیت اور اثر پذیری معیارِ فیض رسانی تھی کہ ہر قوم اور ہر زمین بقدر صلاحیت حصہ یاب ہوئی، بوجہل قریشی تھا اور خزانے کے پاس مگر مدت العمر محروم رہا۔ بلال حبشی اور صہیب رومی تھے۔ پھر کس قدر دُور۔ مگر ان کے دامن دیکھیے تو مالا مال تھے۔ ابرِ کرم کہاں نہیں برستا؟ مگر ہر زمین لالہ زار نہیں بن جاتی۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

یہ اسی فیاضانہ فیض بخشی کا نتیجہ تھا کہ عرب گو مبداء ومنشاء اسلام تھا۔ مگر اس کی کوئی خصوصیت نہیں رہی۔ نومسلم قومیں جو دور دراز ملکوں سے آئی تھیں ہر علم وفن میں اس طرح دست برعلم ہوئیں کہ خود عرب کو ان کے لیے اپنی صفیں توڑ دینی پڑیں یہاں تک کہ آج تراجم ورجال کی کتابیں اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو کوئی علم وفن ایسا نظر نہیں آتا جس پر نومسلم قوموں کا تسلط نہ ہو۔ حتیٰ کہ فقر وتصوف جس کی مذہب کے سائے میں پرورش ہوئی ہے، اس کی تاریخ بھی نومسلم اشخاص کی خود فروشیوں کی منت پذیری سے آزاد نہیں، بات یہ ہے کہ خدا کی محبت کی طرح اسلام کی بے دریغ فیض بخشی بھی اس طرح عام تھی کہ نسب وقومیت کے امتیازات کو اس میں دخل نہ تھا۔ سرچشمۂ فیضان الٰہی تشنگانِ محبت کو ڈھونڈتا ہے، نسب وقومیت اور رنگ وخاندان سے اسے کیا سروکار؟

اس عام فیض بخشی کی ایک نمایاں نظیر سرمد کی سوانح عمری بھی ہے، وہ ایران کے کسی ارمنی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور مذہباً یہودی یا مسیحی تھا۔ آغازِ عمر ہی میں فیضانِ الٰہی کی نظر انتخاب اس پر پڑی، اور جذبِ ہدایت کی کشش نے مشرف باسلام کیا۔

خاندانی نام:

خاندانی نام کا پتا نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد کیا نام رکھا گیا۔ عام طور پر صرف سرمد ہی کے لقب سے تذکروں میں ذکر کیا گیا ہے اور سچ یہ ہے کہ سرمد کا بے نام ہونا جائے تعجب نہیں۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی شرع میں بے نام ونشان رہنا تو رکن اولین بلکہ شرطِ ایمان ہے۔

باوجودت زمن آواز نیامد کہ منم

لیکن بعض تذکروں میں ''سعید اے سرمد'' کے عنوان سے اس کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسلامی نام کا ایک جزو شاید لفظ سعید ہوگا جو بقاعدۂ تخفیف تخلص کے ساتھ مشہور ہوگیا۔

تحصیلِ علمی:

تحصیلِ علمی کا حال معلوم نہیں، لیکن تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ علم وفضل اور عربیت میں درجۂ کمال رکھتا تھا، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تحصیلِ علمی اس زمانے کے نصاب کے مطابق کامل ہوگی۔

ابتدائی پیشہ:

ابتدائی پیشہ تجارت تھا۔ ایران سے تجارتی اموال لے کر ہندوستان کی طرف بڑھا، اس زمانے میں علم وفن کی طرح جنس ومتاع کی بھی نمایش گاہ ہندوستان تھا۔ مگر یہ جوان تاجر جو بے خبر ہندوستان کی طرف قدم زن تھا، نہیں جانتا تھا کہ وہاں پہنچ کر کس تجارت میں اپنا تمام سرمایہ لگا دینا پڑے گا۔ وہ شاید ایرانی مصنوعات فروخت کر کے ہندوستان کی قیمتی اجناس اور

محمود عالم کانوں کے لعل و الماس خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ قضا و قدر اس کے خلاف فیصلہ کر چکی ہے۔ تجارت تو اسے بہرحال آخر حیات تک کرنا پڑے گی مگر ذخارف مادی کی تجارت گاہوں میں نہیں، بازارِ حسن و عشق میں جہاں سونے چاندی کی جگہ دل صد پارہ اور جگر صد زخم کا سکہ رائج ہے اور جہاں کی تجارت یہ ہے کہ صبر و شکیب، ہوش و خرد اور دل و جگر دے کر ایک غلط اندازِ نظر، ایک چین بجبیں، ایک تغافل پیشہ نگاہ خرید لیجیے کہ اس سہل قیمت پر یہ متاع بالکل مفت ہے۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ می تواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

اور صرف اتنا ہی نہیں کیوں کہ یہ تو اس بازار کی نمایشی اور سامنے کی چہل پہل ہے، اگر ہمت قدم آگے بڑھائے تو پھر وہ آخری سودا بھی کرنا پڑے گا۔ جس کی قیمت نقدِ جان ہے۔ اور جس میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ حیات کا لبریز پیمانہ خون شہادت کے ایک لبریز جام سے بدل دیا جاتا ہے اور 'ثمن بخس' کے معاوضہ میں یوسف ملے تو کون خیرہ نظر ہے جو اس متاع کا مشتری نہ ہو۔

دو عالم نقد جاں بر دست دارند
بہ بازارے، کہ سودائے تو باشد

اس زمانے میں ایرانی سیاح عموماً سندھ ہو کر ہندوستان آتے تھے، سندھ کے شہروں میں ٹھٹھ ایک مشہور شہر تھا۔ جس کو اب نئے جغرافیہ میں گمنامی کا خانہ نصیب ہوا ہے! یہی ٹھٹھ وہ سینائے مقدس تھا جو سرمد کے لیے تجلّی گاہ ایمن بنا اور لیلائے حسن نے اوّل اوّل اپنے چہرے سے نقاب اُلٹی، کہتے ہیں کہ ایک ہندو لڑکا تھا۔ جس کی چشم کافر نے یہ افسوس طرازی کی اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ کیوں کہ عشق خیز دلوں کو دو نیم کرنے میں بخیہ گر کی سوئی اور جلاد کی تیغ دونوں برابر ہیں، یہاں تجارت میں خریدار عموماً بے پروا و بے نیاز مگر صاحب جنس غرض مند ہوتا ہے۔ پھر جو لوگ اپنے دلوں کو ہاتھوں پر بطرزِ نذر رکھے ہوئے خریدار ڈھونڈتے ہوں انھیں تو

حق ہی نہیں کہ خریدار میں خاص اوصاف کے طالب ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادہ لوح ایرانی تاجر بھی متاعِ دل کی کسمپرسی سے تنگ آ گیا تھا اور خود خریدار کو بیتابانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ جب خریدار مل گیا تو نظر اُٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ کون ہے اور کیا لے کے آیا ہے؟ اسی کو غنیمت سمجھا کہ دل جیسی متاع ارزاں کی ایک چشم سحر کار طالب ہے اور بلا تامل یہ سودا منظور کر لیا۔

دلال عشق بود و خریدار جانستان
خود را فروختیم چہ سودا بما رسید

سرمد کو آیندہ جس صحرا میں بادیہ پیمائی کرنی تھی، یہ اس کی طرف پہلا قدم تھا۔ اور کچھ سرمد ہی کی خصوصیت نہیں، عشق خواہ کسی عنوان سے ہو منزل حقیقت کا ہمیشہ سے پہلا قدم ہے۔ عشق تو وہ دروازہ ہے کہ جس سے گزرے بغیر انسان انسان نہیں ہو سکتا جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں میں تری نہیں اس کو معنیٰ انسانیت سے کیا واسطہ؟ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ زاہد معتکف بھی باایں ہمہ تعبس و تقشف جب اپنے زاویۂ عبادت میں سربزانو ہوتا ہے تو حور و غلمان کی مسکراہٹ سے لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یعنی جو خشک دماغ مسجد کے گوشوں اور حجروں میں دوست کو ڈھونڈھتے ہیں، انہیں بھی اس تصور کے بغیر چارہ نہیں۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست
اندک اندک عشق درکار آورد بیگانہ را

یہی وجہ ہے کہ جو سوختہ جان حقیقت شاہد ازلی کے جانادہ ہیں، انھیں بھی عشقِ مجازی کے کوچوں میں در و دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا گیا ہے، کیوں کہ دِل جب تک لذت آشنائے درد نہ ہو برف کی ایک قاش ہے جس کو پانی بنتے دیکھا ہے۔ مگر برف آگ میں جلتے ہوئے کبھی نظر نہ آئی، حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے، اور عشق کا کلیسا، آتش کدہ ہے، یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنے دلوں کو اس آتش کدے پر نذر چڑھا دیں اور پھر دامن سے ہوا بھی دیتے جائیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے۔

افسردہ را نصیب نباشد دل کباب
آں یابداں نوالہ کہ مہمان آتش ست

عشقِ الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسوا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ مگر انسان آب وگل کے تعلقات میں اس طرح پا بہ گل ہے کہ جب تک، دلِ پُر درد کو کوئی محکم چوٹ نہ لگے اُدھر سے ٹوٹ نہیں سکتا۔ مکھی جب شہد پر بیٹھ جاتی ہے تو جب تک اُڑائیے نہیں، نہیں اُڑتی۔ انسان کا دل بھی جب تک چوٹ نہ کھائے دُنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے۔ عشق کا فرشتہ اپنے بازوؤں میں وہ مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے کہ اس کی تیغ کا پہلا ہی وار خون کے تاروں سے بندھے ہوئے رشتوں اور دُنیا کی دل فریبیوں کی جکڑی ہوئی زنجیروں کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے، اور دل جب ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو حلقۂ ازل کے سوا اور کوئی بیڑی پاؤں میں نہیں ہوتی۔ اسی درد کے لیے عارف عطار بے قرارانہ وفغاں ساز ہے کہ:

کفر کافر را و دیں دین دار را
ذرۂ دردے دل عطار را

غور کرو جس مردہ دل کو کبھی یہ وقت خوش نصیب نہ ہوا کہ کسی بندِ نقاب کے ٹوٹنے کے تصور میں اپنے خرمنِ ہوش وحواس پر بجلیاں گرائے، اس کو شاہدِ حقیقت کا نظارہ حواسِ ظاہری سے کب ہوسکتا ہے؟ جس افسردہ تنفس نے اپنی عزیز اور شیریں راتیں کسی نرگس خواب آلود کی یاد میں نہ کاٹی ہوں، اس کو معشوقِ حقیقی کی یاد میں بے چین راتیں کب نصیب ہوسکتی ہیں؟ جس خیرہ دماغ نے اپنے سرمایۂ عجز و نیاز کو کسی مغرور ناز کی کج ادائیوں اور بے نیازیوں پر نثار نہ کر دیا ہو وہ خود پسندی اور خود آرائی کے بت کیوں کر توڑ سکتا ہے؟ جس بے حس کو کسی پیکرِ حسن کی صدائے شیریں نے مبہوت و لایعقل نہ کر دیا ہو۔ اس کو سازِ ازل کی نغمہ سرائی پر کیوں کر وجد آئے؟ غرض کہ جس بدنصیب کو کسی مست حسن کی نگاہِ بے محابا بے خود نہ کر سکی۔ اسے جلوۂ طور پر کیوں غش آنے لگا؟ جو فتیلہ پہلے جل چکا ہو وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے۔ لیکن نئے فتیلہ کو بہت دیر

تک آگ دکھلانی پڑتی ہے۔

محبت بادلِ غم دیدہ الفت بیشتر گیرد
چراغے را کہ دودے ہست در سر زود تر گیرد

نظریں اگر جویائے حسن ہیں تو روئے پنہاں کے نظارے کی کیوں منتظر ہیں؟ انھیں تو پردۂ نقاب کی زیبائی ہی پر لوٹ جانا چاہیے۔ کنعان کی گم کردہ پسر آنکھوں نے جلوہ یوسفی کا انتظار نہیں کیا۔ پیراہنِ یوسفی کی بو پاتے ہی آنکھیں کھل گئیں۔ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْ لَا اَنْ تُفَنِّدُوْنَ۔ یہی وجہ ہے کہ مے خانۂ حقیقت میں جب مجلس گرم ہوتی ہے تو پہلے جام و مینا کا دَور چلتا ہے۔ اور جب اس کے تلخ گھونٹ گورا ہو جاتے ہیں تو پھر خود ساقی اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دیتا ہے کہ اب جام وسبو کی ضرورت نہیں، اس کی نگاہ نشہ خیز سے، خود رفتگی و خود گزشتگی حاصل کیجیے۔

مے حاجت نیست مستیم را
در چشمِ تو تاخمار باشد

سرمد کے آگے بھی یہ جام رکھا گیا اور جام کی خوبی بہت کچھ جام پیش کرنے والے ہاتھ کی رعنائی پر منحصر ہے۔ اس لیے ہم اس ہندو لڑکے کو بھولنا نہیں چاہتے۔ جس کی نگاہ لیلیٰ روش نے سرمد کو مجنوں بنایا۔ مگر افسوس کہ ہر عاشق قیس وفرہاد کی قسمت کہاں سے لائے؟ سرمد کے لیلیٰ کا زیادہ سے زیادہ جو حال معلوم ہوتا ہے، یہی ہے کہ ایک ہندو لڑکا تھا اور غور کیجیے تو یہ بھی بہت ہے کیوں کہ بازارِ عشق میں جب سودا چکایا جاتا ہے تو کب یہ دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے اور کیا قیمت مل رہی ہے؟

مرا فروخت محبت ولے نمی دانم
کہ مشتری چہ کس است و بہاے ما چند است

اربابِ تذکرہ اس میں بھی ہم آہنگ نہیں کہ یہ واقعہ کہاں ہوا؟ والہ داغستانی لکھتا ہے کہ بندر سورت میں، اور آزاد بلگرامی نے اپنے کسی تذکرے میں عظیم آباد پٹنہ لکھا ہے۔ لیکن

ان سب میں مرأۃ الخیال قدیم العہد ہے اور اس کا بیان ہے کہ ''در اثنائے تجارت بشہر تتہ افتاد۔ بر ہندو پسرے عاشق گشت'' اس لیے ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ بہرکیف بجلی کہیں گری ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ دہقان کے خرمن سوختہ کا کیا حال ہوا؟

عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں، ہر عاشق کو قیس نہ ہو، مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے، اور جب عشق آتا ہے تو عقل وحواس سے کہتا ہے کہ میرے لیے جگہ خالی کر دو۔ سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور جذب وجنون اس طرح چھایا کہ ہوش وحواس کے ساتھ تمام مال و متاعِ تجارت بھی غارت کر دیا۔ دنیوی تعلقات میں سے جسم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی۔ بالآخر اس بوجھ سے بھی پاؤں ہلکا ہو گیا کہ پابندیاں تو مدعیان ہشیاری کے لیے ہیں۔ مجنون لایعقل مرفوع القلم ہوتے ہیں۔

خطا، بمردم دیوانہ کس نمی گیرد
جنوں نداری و آشفتۂ خطا ایں جاست

بیابان نوردی:

بیابان نوردی عالمِ عشق کی سیر وسیاحت ہے کہ اسی سے انسان کی عقل تجربہ کار و پختہ ہوتی ہے۔ ''مجنوں'' جو صف عشاق میں نمایاں نظر آتا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ صحرا گردی میں کوئی اس کا حریف نہیں، سرمد نے بھی مدتوں صحرا کی خاک چھانی، سندھ کے ریگ زاروں سے تلوے گرم کیے، ہندوستان کے گرم وسرد موسموں کو یکساں عریانی میں کاٹ دیا۔ اور بالآخر جب یہ عقدہ کھلا کہ:

بیہودہ چرا در طلبش می گردی؟
بنشیں! اگر او خداست خود می آید

تو پھر ایک مستقر کی تلاش ہوئی، جہاں بیٹھ کر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کیا جائے۔ لیکن جب نتیجہ یہی تھا تو پھر یہ بیابان نوردی کیوں تھی؟ مگر نہیں خود کہہ چکا ہوں کہ یہ بھی عشق کے قانونِ کمال میں داخل ہے، اور عشق کے قانون میں استثنا نہیں۔

یکے از دستگیری ہاے عشق است
عزیزاں را بہ خواری برکشیدن

یہ وہ زمانہ تھا کہ عنقریب بساطِ ہند پر عالم گیر ایک نئی چال چلنے والا تھا۔ شاہ جہانی حکومت کا آخری عہد اور شہزادہ داراشکوہ ولی عہد سلطنت تھا، سلسلۂ مغلیہ میں داراشکوہ ایک عجیب طبیعت و دماغ کا شخص گزرا ہے، اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے۔ کہ تاریخِ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا۔ اس لیے اصلی تصویر پولیٹیکل چالوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی، وہ ابتدا سے درویش دوست اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقراء اور اربابِ تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی بعض تحریرات جو دست بُرد حوادث سے بچ گئی ہیں، بتلاتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا بھی ذوق و کیفیت سے خالی نہیں، اس کے صاحب ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاشِ مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اُٹھا دی تھی، اور جس نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا تھا، ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں سے بھی رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحبِ حال اختلاف کرسکتا ہے۔ کیوں کہ اگر اس عالم میں بھی کفر و اسلام کی تمیز ہو تو پھر اعمیٰ اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا ہے؟ پروانے کو تو شمع ڈھونڈنی چاہیے، اگر صرف شمع حرم ہی کا شیدا ہے تو سوز طلبی میں کامل نہیں۔

عاشق ہم از اسلام خرابست و ہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر نداند!

سرمد جوشِ جنوں میں پھرتا ہوا جب شاہ جہاں آباد (دہلی) پہنچا تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لیے جائیں۔ کیوں کہ جس جام کی تلاش ہے وہ اسی مے خانہ میں ملے گا۔ مصنف مرأۃ الخیال جو عالمگیر پرستی کے معبد میں صف اوّلین کا طالب ہے لکھتا ہے:- ''چوں خاطرِ سلطان داراشکوہ بجانب مجانین میل داشت صحبت بوے در گرفت'' بے چارہ علی شیر[۱] بھی ہوشیاری و دیوانگی ہی کی بحث میں سرمار رہا ہے۔ اسے کیا خبر کہ دُنیا میں ایسی ترازو بھی ہے جس

[۱] مصنفِ مراۃ الخیال

کے ایک پلّے میں اگر دیوانگی رکھ دی جائے تو دوسرا پلہ تمام عالم کی ہوشیاری رکھ دینے سے بھی نہیں جھک سکتا، اور پھر ایسے خریدار بھی ہیں جن کو اگر ہوش وحواس کا تمام سرمایہ دے دینے سے ایک ذرّہ جنون مل سکتا ہو، تو بازارِ یوسف کی طرح ہر طرف سے ہجوم کریں۔ بہرکیف خواہ کچھ ہو عالم گیر کی ہوشیاری سے تو ہمیں داراشکوہ کی دیوانگی اور جنون دوستی ہی پسند آتی ہے، کہ وہاں تو تیغِ ہوشیاری کشتگانِ حسرت کے خون سے رنگین ہے، اور یہاں خود اپنے جسم کی رگ ہائے گردن سے خون کی نالیاں بہہ رہی ہیں، شاید داراشکوہ بھی عالم گیر جیسے ہوشیاروں کی ہوشیاری سے تنگ آ گیا تھا۔ اسی لیے اس نے سرمد جیسے مجانین کی صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی۔

غرضیکہ سرمد داراشکوہ کی صحبت میں رہنے لگا، اور اسے بھی سرمد سے کمالِ عقیدت تھی۔ اس زمانے میں عشق کی شورش انگیزیاں کبھی کبھی اسے باہر نکلنے پر مجبور کرتیں، لیکن چوں کہ معلوم ہو چکا تھا کہ آخری امتحان گاہ یہی ہے۔ اس لیے شاہ جہاں آباد سے نکل نہیں سکتا تھا، یہاں تک کہ شاہجہاں کی علالت اور داراشکوہ کی نیابت نے عالمگیری ارادوں کے ظہور کا سامان کر دیا، اور ایک عرصے کی شورش اور خوں ریزی کے بعد ۱۰۶۹ھ میں عالمگیر اورنگ زیب تخت نشینِ حکومت ہوا۔ یہ زمانہ داراشکوہ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کے لیے خود داراشکوہ سے کم مصیبت انگیز نہ تھا۔ بہت سے لوگ تو داراشکوہ کے ساتھ نکل گئے، اور جو رہ گئے اُنھوں نے اپنے آپ کو کشتیٔ طوفان میں پایا۔ لیکن اس رہین بے خبری کو اپنے استغراق میں اس کی فرصت کہاں ملتی تھی کہ دُنیا کو نظر اُٹھا کے دیکھے۔ اور اگر دیکھتا بھی تو وہاں سے کیوں کر نکلتا۔ کیوں کہ بایں ہمہ بے خبری اس سے بے خبر نہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے عشق کی ابتدائی منزلیں تھیں۔ آخری منزل طے کرنی باقی ہے، اور وہ یہیں پیش آنے والی ہے۔

بیک دو زخم کہ خوردن ز عشق ایمن مباش
کہ در کمیں گہ ابرو کماں کش ست ہنوز

سرمد کی شہادت:

سرمد کی شہادت کے اسباب تذکرہ نویسوں نے مختلف بتلائے ہیں، تذکرہ ''مرأۃ

الخیال'' میں ہے کہ سرمد کی اس رباعی پر جبہ پوشان شرع کے کان کھڑے ہوئے، اور انھوں نے اسے کفر قرار دیا کہ معراج جسمانی سے انکار لازم آتا ہے۔

ہر کس کہ سر حقیقتش پادر شد — او پہن تراز سپہر پہنا در شد
ملاّ گوید کہ برفلک شد احمدؐ — سرمد گوید فلک بہ احمدؐ در شد

مگر اس ترک سادہ کو فقیہانہ جنگ و جدل سے کیا سروکار تھا، اس نے نظر اُٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ یہ کور بصر کیا شور وغوغا کر رہے ہیں؟ وہ تو اس عالم میں تھا، جہاں ان اقرار و انکار کی بحثوں کی آواز بھی نہیں پہنچ سکتی۔

در عجائب ہائے طور عشق حکمتہا کم است
عشق را با مصلحت اندیشیٔ مجنوں چہ کار

لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سرمد کا سب سے بڑا جرم داراشکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ پالٹیکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے، اور ہزاروں خونریزیاں جو پولٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں۔ انھیں مذہب کی چادر اوڑھا کر چھپایا گیا ہے۔ جب کوئی اور بہانہ نہ ملا تو عریانی و برہنگی کو کہ خلاف رسم شرع ہے بنیاد قرار دیا اور مذکورہ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراجِ جسمانی کا منکر ہے۔ ملا قوی اس زمانے میں قاضی القضاۃ تھے۔ عالمگیر نے انھیں سرمد کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں۔ ملا صاحب نے کہا کہ باوجود کمالِ علم و کمال و فضل برہنہ و مکشوف العورات رہنا کسی عذر پر مبنی ہے۔ سرمد نے کہا کیا کروں شیطان قوی ہے۔ اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی۔

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا
چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من ست و من در طلبش
وزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

ملا صاحب برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات ہی تھی کیوں کہ اسلام کی توہین نہیں

کی گئی۔ بلکہ خود ان کے وجود اسلام عبارت کی سخت اہانت ہوئی یعنی ان کا اسم سامی ابلیس لعین کا وصف قرار پایا۔ بہرکیف اُنھوں نے عالمگیر سے آ کر کہا کہ کفر کا کافی مواد ہاتھ آ گیا ہے اور قلمدان کھولنا چاہا کہ علماے ظاہر کی تیغ خون آشام اسی نیام میں رہتی ہے۔ لیکن عالمگیر کی عاقبت اندیشیوں نے صرف اس بہانے کو کافی نہ سمجھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ سرمد کوئی معمولی شخص نہیں ہے، جس کا قتل ایک عامہ الورود واقعہ سمجھا جائے گا۔ علم وفضل کے لحاظ سے کوئی اس کا ہمتا نہیں، اور رجوع خلایق کا یہ حال ہے کہ سارا شاہجہاں آباد اس کا معتقد اور ہوا خواہ ہے۔ اس لیے جب تک کوئی بہانہ قوی ہاتھ نہ آئے اس ارادے کو ملتوی رکھنا چاہیے۔

اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصے میں فقہا کا قلم ہمیشہ تیغِ بے نیام رہا ہے، اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان کے فتوؤں کا دامن گیر ہے۔ اسلام کی تاریخ کو کہیں سے پڑھو۔ سینکڑوں مثالیں کہتی ہیں کہ جب بادشاہ خونریزی پر آتا تھا تو دارالافتا کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے، صوفیہ اور اربابِ باطن پر منحصر نہیں، علمائے شریعت میں سے بھی جو نکتہ بین اسرار حقیقت کے قریب ہوئے، فقہا کے ہاتھوں انھیں مصیبتیں اُٹھانی پڑیں، اور بالآخر سر دے کر نجات پائی۔ سرمد بھی اسی تیغ کا شہید ہے۔

چوں می رود نظیری خونیں کفن بحشر
خلقے فغاں کنند کہ ایں دادخواہ کیست

آخر الامر یہ قرار پایا کہ سرمد کو علما وفضلاے عصر کے مجمع میں طلب کیا جائے، اور تمام علماء کی جو رائے قائم ہو، اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ مجلس منعقد ہوئی اور سرمد کو بلایا گیا۔ سب سے پہلے خود عالمگیر مخاطب ہوا، اور پوچھا لوگ کہتے ہیں کہ سرمد نے داراشکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟ سرمد نے کہا کہ ہاں اور وہ مژدہ درست نکلا کہ اسے ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ عمامہ بندوں نے کہا، کہ برہنگی شرع کے خلاف ہے، اور اس کے لیے صاحبِ عقل وتمیز کا کوئی عذر مسموع نہیں، اس کا جواب تو سرمد پہلے دے چکا تھا۔

دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

خلیفہ ابراہیم بدخشانی اواخر عہدِ عالمگیری میں ایک صاحبِ طریقت بزرگ گزرے ہیں جو ابتدائے جوانی میں سپاہی پیشہ تھے اور فتح اللہ خان کے ہاں کہ امرائے عالم گیری میں سے تھا، نوکر ہو گئے تھے۔ اتفاقاً میر جمال الدین بدخشانی ثانی ایک صاحبِ حال بزرگ کی اُن پر نظر پڑ گئی اور اُن کو فیض پذیر دیکھ کر اپنی اپنی تربیت میں لے لیا۔ رفتہ رفتہ یہ خود بھی صاحبِ حال ہو گئے۔ علمِ ظاہری کی تحصیل کا موقع نہ ملا لیکن مذاق فطری کا یہ حال تھا کہ مثنوی معنوی کا دفتر ہفتم چار حصوں میں نظم کیا جو درد و کیفیت سے لبریز ہے۔ معز الدین جہاندار شاہ کو ان کی خدمت میں کمالِ اعتقاد تھا اور ہندوستان و دکن میں ہزاروں اشخاص ان کے معتقد و حلقہ بگوش تھے۔

والہ داغستانی انھی بزرگ سے روایت کرتا ہے کہ جب مجمع علماء میں سرمد کو لباس پہننے کے لیے کہا گیا اور مسموع نہ ہوا تو بادشاہ نے علماء سے کہا کہ محض برہنگی وجہِ قتل نہیں ہو سکتی۔ اس سے کہا جائے کہ کلمۂ طیبہ پڑھے، اور یہ اس لیے کہا کہ بادشاہ سن چکا تھا کہ سرمد کی عاداتِ عجیبہ میں سے ایک یہ عادت بھی ہے کہ کلمۂ طیبہ جب پڑھتا ہے تو لا الٰہ سے زیادہ نہیں کہتا۔ علما نے سرمد سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب صرف لَا اِلٰہَ پڑھا کہ جملہ نفی ہے۔ اس پر علماء نے شور مچایا۔ تو کہا ''ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں، مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا۔ اگر اِلّا اللّٰہ کہوں گا تو جھوٹ ہوگا۔ اور جو دل میں نہ ہو وہ زبان پر کیسے آئے؟'' علما نے کہا ایسا کہنا کفرِ صریح ہے، اگر توبہ نہ کرے تو مستحق قتل ہے، یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمد اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر و ایمان کی بحثیں سنائی جائیں، وہ قتل و خون کے احکام سے مرعوب ہو۔ یہ کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر سوچتے تھے کہ اس کی کرسی کتنی اونچی ہے، اور وہ اس منارۂ عشق پر تھا جہاں کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں، اور جہاں کفر و ایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں۔

کشورے ہست کہ دروے رود از کفر سخن
ہمہ جا گفت و شنو بر سر ایماں نہ رود

سرمد نے تو اپنی حالت، بے کم و کاست بیان کر دی تھی، ایمان بالغیب پر جو لوگ

قانع نہیں ہوتے۔ اس عدم قناعت ہی کا نام تلاشِ حقیقت ہے اور وہ اپنے اقرار کو مشاہدۂ عینی سے استوار کرنا چاہتے ہیں اور شاہد حقیقت کی رونمائی نقد شہادت ہے جو ابھی سرمد کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس جس چیز کو دیکھا نہ تھا۔ کیوں کر کہتا کہ ''ہے''۔ اس ملک کے جتنے رہرو ہیں، سب ہی کو اس منزل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن سرمد کا جرم یہ تھا کہ وہ جس جام کو چھپ کر پیتے ہیں، سرمد نے علانیہ منہ سے لگایا اور دُرّۂ محتسب کا مستحق ٹھہرا:

خرقہ پوشاں ہمہ گر مست گزشتند گزشت
قصہ ماہست کہ در کو چہ و بازار بماند

اور نظر تعمق سے دیکھیے تو یہ اعلان ضروری تھا، کیوں کہ جب اس سفر کی آخری منزل شہادت تھی تو خواہ ناقہ کا رُخ کسی طرف ہوتا دست کارفرما کا فرض تھا کہ اس طرف پھیر دے۔

منصور را کہ رخصتِ اظہار دادہ اند
غیر از قصاص و محنت زنداں نبودہ شرط

غرض کہ جب سرمد نے توبہ نہ کی تو علماء نے بلا تامل فتویٰ صادر کیا اور دوسرے دن قتل گاہ میں لے گئے۔ بموجب بیانِ ''مرأۃ الخیال''۔ یہ واقعہ ۱۰۷۲ھ میں ہوا کہ عالم گیر کی تخت نشینی کو تین سال سے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا۔

موبمویم دوست شد ترسم کہ استیلائے عشق
یک انا الحق گوے دیگر برسردار آورد

شاہ اسد اللہ نامی ایک مرد درویش وحق آگاہ راوی ہیں: ''مجھے سرمد کی خدمت میں کمالِ خصوصیت حاصل تھی، جب شورش و ہنگامہ شروع ہوا، تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک دن موقع پا کر عرض کیا کہ ''اگر اپنی وضع وحالت بدل دیں تو بندگانِ الٰہی کی منت وسماجت دیکھتے ہوئے بہ ظاہر کوئی نقصان نہیں۔ یہ سن کر نظر اُٹھائی اور اپنا یہ شعر پڑھ دیا:

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

جب سرمد کو شہادت گاہ لے چلے تو تمام شہر ٹوٹ پڑا، اور اس قدر ہجوم تھا کہ راستہ چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہیے جہاں کا عام پسند تماشا خوں ریزی ہے، جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دل پسند کھیل نہیں۔ جب کوئی سَر دادہ سر بکف بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دولہا کی سواری جا رہی ہے اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست
تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

مگر یہ عشق مجازی تھا کہ سر بام آنے کی خواہش کی گئی ورنہ سرمد کو تو سر اُٹھانے کی بھی ضرورت نہ ہوئی، جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو مسکرا کر نظر ملائی اور کہا:-

''فدائے تو شوم بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم''

صاحبِ مرأۃ الخیال راوی ہے کہ اس جملے کے بعد یہ شعر پڑھا، اور مردانہ وار سر تلوار کے نیچے رکھ کر جان دے دی۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

صاحبِ مرأۃ الخیال کو عالمگیر کی خوشامد سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ سرمد کی نعش خون آلود پر اشک افشانی کرتا لیکن ستم یہ ہے کہ اس سنگین دلی پر قانع نہ ہو کر چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ خوں ریزی بھی عالمگیر کے دفتر مناقب وفضائل میں جگہ پائے۔ حالاں کہ اس دفتر میں تو پہلے ہی سے ہر صفحہ رنگین ہے، اس کو بھی عشق کی شیوہ گری سمجھئے کہ یہاں کی قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلود ہوتے ہیں وہ مجرم وخونی ہونے کی جگہ تحسین وثواب کا صلہ مانگتے ہیں۔ گویا میدانِ عشق بھی قربان گاہِ منیٰ ہے کہ جس قدر بھی خون بہائیے عین ثواب ہے۔

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروز عیدِ قربان
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمد کی جہاں قبر سمجھی جاتی ہے، یہ اس کا مدفن نہیں صرف

مشہد ہے۔ لیکن والہ داغستانی نے تصریح کر دی ہے کہ: ''در جنب مسجد جامع گردن او را زدند و در ہمانجا دفن کردند'' یہ مقام موجودہ مزار کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟ پھر لکھتے ہیں کہ ''راقم الحروف زیارتِ مزار وے مکرر مشرف شدہ ام در چہار فصل سبزہ از ترتبش کم نمی شود والحق فیض عجیے در زیارت آن منصور ثانی است۔''

والہ داغستانی عہد محمد شاہی میں تھا، اور اس کے تذکرے کا سال تصنیف ۱۱۶۰ھ ہے۔ لیکن آج بھی مشہد سرمد زیارت گاہِ عوام وخواص ہے، اور ہمیشہ فاتحہ کے ہاتھ اس کے آگے رو بہ آسماں رہتے ہیں:

برسر تربت حافظ چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندانِ جہاں خواہد بود

خلیفہ ابراہیم بدخشانی راوی ہیں کہ سرمد نے زندگی میں کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہ سے زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن جب شہادت پائی تو لوگوں نے سنا کہ سرکشتہ سے تین بار لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہَ کی صدا بلند ہوئی۔ اس کے علاوہ والہ داغستانی لکھتے ہیں کہ: ''ایک ثقہ جماعت سے سنا گیا ہے کہ سرمد کا سر مقتول کلمۂ طیبہ پڑھتا رہا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ دیر مصروف حمد الٰہی بھی رہا۔'' موجودہ زمانے میں ایسی روایتوں پر لوگ بمشکل یقین لائیں گے اور سوانح نگار کا فرض ہے کہ خوش اعتقادی کی روایات اور تاریخ کو الگ الگ رکھے۔ لیکن ہمیں تو یہ بیان پڑھ کر کچھ بھی تعجب نہ ہوا۔ کیوں کہ اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں ہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں سے بھی محروم ہو جانا چاہیے؟ ہم نے بہار میں شگفتہ وشاداب پھولوں اور خزاں میں افسردہ وخشک شاخوں کو باتیں کرتے دیکھا ہے۔ پھر اگر ایک شہیدِ عشق کے سر مقتول کے لب ہلتے نظر آئیں تو کیوں تعجب ہو؟ ممکن ہے کہ سرمد کے بے جان سر سے آواز نکلی۔ مگر اربابِ بصیرت نے اس کی زبانِ حال کو ضرور متکلم دیکھا ہو، اور ڈھائی سو برس سے زیادہ گزر گئے۔ ہمارے کانوں میں تو اب تک مشہدِ سرمد سے صدا آ رہی ہے کہ:

کس چہ داند قدر مردن ہائے عشق
منتِ ایں مرگ بر جان من است

عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشین ہوا، اور تین سال کے بعد سرمد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ایک قرن سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ

خونے کہ عشق ریزد ہرگز ہدر نباشد

یہ سرمد کے خون ہی کی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالمگیر کو کبھی راحت و اطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ پیغامِ اجل بھی آیا تو عالمِ غربت و پریشانی میں۔ مگر سوانح نویس کے قلم سے ایسے جملے نہیں نکل سکتے۔ ہمارے لیے تو یہی بہتر ہے کہ ہو سکے تو عالمگیر کو بھی اس معاملے میں معذور سمجھیں۔ تاریخ قیاس وظنون اور شخصی آرا کے مجموعہ کا نام ہے۔ آج چند میلوں کے فاصلے پر ایک حادثہ گزرتا ہے تو اخباروں کے دو نامہ نگار متفق البیان نہیں ہوتے۔ کس کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی، اور عالمگیر کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا؟ پھر یہ بھی ہے کہ خونِ رفتگانِ عشق جب اپنے قاتلوں سے گلہ مندِ جفا نہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ ان کی شکایت سے قلم آلودہ ہوں۔ جب سرمد نے جلاد سے کہا: ''تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم'' تو اسے عالم گیر اور عالمگیری علماء سے کیا شکایت ہوگی؟ بات یہ ہے کہ دیارِ محبت میں انتقام و دعویٰ کی شنوائی نہیں۔ اور عشق کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لے کر آئے تو سر جھکا دیجیے۔ اور ہو سکے تو اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجیے۔

شد است سینہ ظہوری پُر از محبتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جانیست

سرمد کے کلام کا ایک صحیح اور قلمی نسخہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے مگر اس وقت پیشِ نظر نہیں۔ چند سطروں کا ارادہ تھا، مگر کئی صفحے ہو گئے اور عشق کی حکایت کب ختم ہونے والی ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ روحِ سرمد پر دستِ فاتحہ اُٹھا کا خاموش ہو جاؤں۔ آئندہ کبھی موقع

ملا تو سرمد کا کلام پیش کروں گا۔ افسوس کہ یہ داستاں مختصر نہ ہوسکی، مگر شہیدانِ عشق کی محبت میں جتنی دیر افسردہ رہ سکے، بہتر ہے۔

لذید بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسی اندر طور